ہمچو اد ھم بحر حق با یک پیالہ جستہ اَم　　مثل قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ بابا عبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۴

علی گڑھ

شیفیلڈ سے واپس علی گڑھ آئے تو ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر پر مسلسل زور دینا شروع کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ان کے بار بار مجبوریوں کے اظہار کرنے کے باوجود قبلہ درانی صاحب اکثر گھنٹوں ان کے برآمدے میں بیٹھے رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر آتے جاتے پڑ جاتی مگر کام نہ بنا۔ اُدھر درانی صاحب کے لئے یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ علی گڑھ میں مستقبل کے صرف ڈپٹی کلکٹر اور آئی سی ایس ڈھالے جا رہے ہیں لیکن ملک کی تعمیر اور قومی مفاد کی خاطر جن علوم کی آئندہ زمانے میں خاص طور پر ضرورت ہے انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ آخر کو دو ایک سال کی بات چیت اور حُجت کے بعد ایک پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی اور ۱۹۴۲ء میں اسے ڈگری کالج کی شکل دے دی گئی۔ زمانہ نے ثابت کیا کہ اس کالج نے مسلمان انجینئروں کی ایک بھاری تعداد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان بھر میں مشکل سے پندرہ انجینئر ہر سال بنتے تھے۔ لیکن اس کالج کے قیام کے بعد ہر سال ایک سو بیس مسلمان انجینئر بننے لگے۔ قبلہ دُرانی صاحب اس پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل تھے اور جب ان کی کوششوں سے کالج بنا تو ان کو صرف الیکٹریکل ڈپارٹمنٹ کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ علی گڑھ کے اس انجینئرنگ کالج کے لئے جس زر کثیر کی ضرورت تھی وہاں علی گڑھ یونیورسٹی کا ہاتھ بٹانے کے لئے خود قبلہ نے رامپور اور بھوپال کے نوابانِ ریاست سے رابطہ قائم کر کے امداد حاصل کی اور اپنی اس آرزو کے پورا ہونے کے لئے اجمیر کے راجہ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے دربار میں بھی جبیں فرسائی کی تھی۔ پھر جب سلطان الہندؒ سے فرمانِ مقبولیت مل چکا تو یہ آرزو کیسے پوری نہ ہوتی۔ اس کالج کا پرنسپل بننے کی نہ تمنا تھی نہ کوشش۔ جسم و تن، دل و جان ایک ہی دُھن میں تھے جو پوری ہو کر رہی اور یہ ہی نہیں بلکہ اس دور میں جو بھی طالب علم اس کالج سے تعلیم حاصل کر کے نکلے ان کے دلوں میں بھی وہی جذبۂ خدمت قوم ان کی زندگیوں کا سرمایہ بن کر اُبھرا اس کالج کے بنانے میں بس یوں سمجھیں کہ اپنے ہاتھوں اور اس وقت کے توانا جسم سے جتنا بھی کام ہو سکا وہ رات دن کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک تعمیری کاموں کے لئے اخراجات کا اکٹھا کرنا۔ سامان مہیا کرنا۔ انجینئر اور ان کے عملے سے عملی رابطہ قائم رکھنا۔ خود شریک کار ہو کر مزدوروں، مستریوں میں جوشِ عمل برقرار رکھنا، اپنے اور ساتھیوں کے لئے ایک لائحہ عمل بن گیا۔ دل بہ یار دست بہ کار کے مقولہ کو یوں اپنا لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے کچھ مجبوری کچھ سرد مہری۔ اپنی نجی زندگی میں عزیز شریکۂ حیات کے انتقال کا گہرا زخم۔ بابا تاج الدینؒ کے پردہ فرمانے کے بعد وہ تنہائیوں کا خلا۔ مگر اس کالج کے کام کو چھوڑ کر، غم میں ڈوب جانے کی بجائے غم امت میں تبدیل کر لیا یہاں تک کہ قیام پاکستان کے بعد میں بھی قبلہ درانی صاحب اس کالج کے تعمیری کاموں اور ترقی میں لگے رہے۔ خود اپنے ہاتھوں سے کام کرنے میں بالکل نہ شرماتے۔ مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتے۔ اسی دوران ایک الماری اپنی کمر کے بل سرکاتے ہوئے ریڑھ کی ہڈی میں لکڑی چبھی، زخم پک کر ناسور بنا اسی زخم اور ناسور کی بیماری میں بھی جب تک جسم میں سکت رہی کام کرتے رہے۔

ایک دفعہ علی گڑھ یونیورسٹی نے کلکتہ ڈیوٹی پر بھیجا۔ یہاں جا کر جنگ کا بچا ہوا زائد سامان مفت حاصل کرنا تھا۔ ٹرک میں سامان لے کر چلے۔ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوا۔ بیہوشی کی حالت میں ہسپتال لے جائے گئے۔ امریکن ڈاکٹر نے اچھی طرح دیکھا جانچا مگر نہ سانس نہ جان۔ اس نے اپنے

نزدیک مُردہ قرار دے دیا اور اس کی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس مُردہ جسم سے پھر سے چار پانچ منٹ بعد زندگی کے آثار آ گئے۔ یہ اور اس ثبوت کی بات تھی کہ رُوح کی حیات کے ہوتے ہوئے جسم کی فنا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جسمانی زندگی پر روح کا دارو عمل ہے۔ جب شدت عشق میں روح کی گہرائیوں تک اثر ہو چکا ہو۔ نگاہ کسی پر جم چکی ہو، تو اس مدعا کے حصول سے پہلے، روح، قالب کو کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اس موت کے کیف کو قبلہ اکثر بیان کرتے ہیں کہ وہ انبساط، ہوبے پایاں کشادگی، آزادی اور قدوسی خوشی کی کیفیت الفاظ میں نہیں آتی اس حالت میں اسی طرح ایک اور مرتبہ جب ٹرک سے سامان اتارا جا رہا تھا تو ایک بھاری ٹرانسفارمر اُن کو اور ایک مستری کو مل کر اتارنا تھا۔ مستری نے بوجھ اٹھانے کی تاب نہ لا کر سارا ٹرانسفارمر کا بوجھ قبلہ پر چھوڑ دیا اور قبلہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ دیکھنے والے یہی سمجھے کہ ختم ہیں۔ مگر جن کی قسمت میں فنا در فنا کی منازل سے گزر کر ہی حیاتِ جاوید میں قدم رکھنا ہے مقرر ہو ان کے لئے یہ موتیں ایک تجدید مذاقِ زندگی ہی ہوا کرتی ہیں۔ یہ قلندرانہ زندگی کا وہ سیلاب سا ہوتا ہے کہ ہر روکاوٹ کے بعد موج زندگی کچھ اور شدت سے ابھرتی ہے اور حیاتِ جاوداں ایسے پیکروں میں سے گزرتی ہوئی ایک نئی دمک اور ادا کی حامل ہو جاتی ہے پھر یہ فروغِ زندگی اردگرد کے ماحول میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اسی کالج کے ایک فارغ التحصیل تابندہ نگینے حسن اختر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۰ء تک قبلہ درانی صاحب کو علی گڑھ میں بہت قریب سے دیکھا تھا۔ عمر میں گو چھوٹے تھے اسی لئے اپنی اس وقت کی فہم کے مطابق ہی ان تک رسائی رہی۔ اُن کی نگاہوں میں اس وقت بھی قبلہ صاحب نہایت نرم گفتار، مشفق اور مخلص ساتھی تھے۔ اس وقت بھی عبید بھائی اب بھی عبید بھائی۔ اُن کے آگے جن درّانی صاحب کا نقشہ گزرتا ہے وہ مستعد، توانا، صحت مند اور ہر وقت کسی نہ کسی کام میں جسمانی طور پر مصروفِ عمل رہنے والے کا ہے۔ ان کے مطابق قبلہ محنت سے پسینہ پسینہ ہو کر ایک سکون سا محسوس کرتے۔ سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے بجلی کے تاروں پر کام کرتے۔ بھاری ہتھوڑے جو حسن اختر نیچے سے پھینکتے ان کو مستعدی سے سیڑھی پر چڑھے ہوئے پکڑ لیتے۔

اسی زمانہ میں قبلہ نے علی گڑھ ایر ٹریننگ کورس میں یونیورسٹی کی طرف سے انچارج کی حیثیت سے کام کیا۔ فلائنگ سکھانے کا کام تو ایئر فورس والوں کے سپرد تھا مگر طلبا کو جمع کرنا اور پروگرام میں شرکت کرانا قبلہ کے ذمہ تھا۔ اسی سلسلے میں قبلہ نے خود بھی فلائنگ سیکھی اور کئی بار جہاز اڑائے۔ ایر ٹریننگ کورس کے سلسلہ میں بھی اچھا خاصہ مشغولیت کا پروگرام ہوتا تھا اور یہ کام تمام جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانہ میں بھی اور بعد میں بھی جاری رہا۔

کلاس روم اور ورکشاپ میں تعلیم دینے کے علاوہ قبلہ کو کالج کے روزانہ ایسے کام کرنے پڑتے جو مستریوں کو کرنے چاہیے تھے۔ جب حسن اختر صاحب نے فارغ التحصیل ہو کر پڑھانے کی ملازمت کرنے کا شوق ظاہر کیا تو قبلہ نے فرمایا۔ ”دیکھو بھائی علم بیچا نہیں جاتا، ہنر بیچا جاتا ہے۔ اسی لئے میں جو یہ بیس روپیہ روزانہ تنخواہ کے حاصل کرتا ہوں اس کے عوض کالج کا بیس روپیہ کا کام کر دیتا ہوں جو مستریوں سے کرانا پڑتا۔ یہ سلسلہ چنانچہ اسی انداز میں جاری رکھا کہ کالج کے لئے مشینیں مرمت کیں یا پُرانے سامان سے جمع کر کے ایسی مشینیں بنالیں جو براہ راست خریدنے میں کافی رقم میں حاصل ہوتیں۔ پھر اسی کالج سے ایک اچھی خاصی تعداد انجینئروں کی نکلی جنہوں نے پاکستان بننے پر اس جسم نوزائیدہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا اور خدا کے فضل سے ان کے باطن کی ریڑھ کی ہڈی بھی وہ مضبوطی لے کر اٹھی کہ انجینئرنگ کے ہر شعبہ میں خانقاہی انداز جما۔ جس طرح زندگی کی ہر بنیاد زمین میں ہوتی ہے۔ اسی طرح فقر کی بنیاد بھی روح، قلب کی بلندیوں تک اٹھانے سے قبل، روزمرہ زندگی کے عملی جسمانی پہلو میں ہی نشو و نما پاتی ہے۔

ایک انہماکِ کار۔ ایک جذبۂ خدمت۔ ایک جمعیت بندی ہی، کسی قوم کے فروغ کی راہ میں پہلا قدم ہوتا ہے۔ اس سطح کی توحید حاصل کرنے کے بعد ہی امتِ واحدہ کی منازل کی راہ کشادہ ہوتی ہے۔

علی گڑھ کے اور ایک تعلیم یافتہ انجینئر غلام کبریا صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے قبلہ کے ساتھ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء تک علی گڑھ میں وقت گزارا۔ پہلے وہاں تعلیم حاصل کی پھر ۱۹۴۵ء میں اُنیس سال کی عمر میں اِدھر ہی لیکچرر مقرر ہوئے۔ طبعاً شوخی کے باعث قبلہ سے اپنے کو سب سے زیادہ قریب تر سمجھتے تھے اور یہی خیال قبلہ سے ہر ملنے والے کا اپنی اپنی بابت تھا کہ وہی قبلہ سے قریب تر ہے۔ قبلہ ایک توانا شخصیت کے حامل تھے۔ ہر کام خود ساتھ لگ کر کرتے۔ کالج کی زیادہ تر مشینری کباڑیوں سے سامان حاصل کر کر کے بنائی تھی کام کرتے رہنے اور کام کرانے کی وہ دھن تھی کہ کبریا کہتے ہیں کہ میں اکثر لوگوں سے کہتا کہ مجھے ایسا بُرا استاد ملا ہے جو کسی کام میں ''نہ'' تو سننا ہی نہیں جانتا ایک دفعہ ہی قبلہ کو ڈانٹتے سنا ہے اور اس ڈانٹ ملنے کا فخر مجھ ہی کو حاصل ہوا ہے اس ڈانٹ نے میری زندگی ہی بدل دی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مجھے ایک سخت کام کاج کے سلسلہ میں کرنے کر دیا۔ میں نے چہرہ پر بناوٹی کرب کا عالم طاری کر کے کام ٹلانے کی کوشش کی تو ڈانٹ کر کہا ''یہ مت کہو کہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یہ کرنا ہے۔ نہ میں نے کسی کو نہ کہی ہے نہ میں نہ سننا چاہتا ہوں۔'' ۱۹۴۷ء میں عمر رسیدہ لیکچررز کی موجودگی میں نو عمر غلام کبریا صاحب کو ہائیڈرولکس لیب اور میٹریل ٹسٹنگ لیب بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور فرمایا میں جا رہا ہوں یہ دونوں لیب تم بنائو گے۔ کس کی مجال تھی جو دخل دیتا۔ قبلہ، کالج کے پرنسپل اور وائس چانسلر کی نگاہ میں عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ لوگ خود قبلہ سے ملنے بنگالی کوٹھی آتے۔ سامان حاصل کرنے کے لئے رقم کہاں تھی لہٰذا ان صاحب نے بھی وہی عمل کیا جو قبلہ کو کرتے دیکھا تھا۔ دادے جی کے پاس جاتے اور بل ان کے پاس چھوڑ کر آ جاتے۔ وہ جانیں اور یونیورسٹی۔ کیونکہ اس قسم کا قرضہ تو اُسی زمانہ سے مختلف جگہوں سے چل رہا تھا جب سے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بنا تھا۔ شروع زمانہ میں تو قبلہ کو یونیورسٹی سے تنخواہ تک نہ ملتی تھی۔ والد صاحب ہی گھر کے اخراجات کے لئے رقم بھیجتے۔ پھر جب چند سالوں کے بعد پہلی تنخواہ ۳۸۰ء یا ۳۹۰ء میں ملی تو اپنی تنخواہ سے لیکچرر بھٹا چارجی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ پندرہ بیس طلبا کو جمع کر کے سٹی اینڈ گلڈز کے امتحان کی تیاری شروع کرائی گئی اس پہلے بیچ میں ممتاز قریشی مرحوم بھی تھے جو بعد میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پروفیسر ہوئے اور جنہوں نے اپنی تمام زندگی قلندرانہ ذوق وشوق اور خدمت خلق کے جذبہ میں گزاری۔ علی گڑھ کے اسی چھوٹے سے انسٹی ٹیوٹ نے یونیورسٹی مارکیٹ کے دو کمروں میں جنم لیا اور ۱۹۴۸ء تک اس میں طلبا کی تعداد چودہ سو تک ہو گئی تھی۔ اسی کالج میں جب قبلہ کے چھوٹے بھائی منان دُرانی صاحب نے ملازمت چاہی تو انٹرویو بورڈ سے قبلہ، بورڈ کے چیئرمین عبید الرحمن صاحب شیروانی سے معذرت کر کے اٹھ گئے تھے اور ایسا ہی کچھ پشاور یونیورسٹی میں کیا جب ان کے بھتیجے نے وہاں ملازمت چاہی تھی۔ ایک دفعہ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ انجینئرنگ کالج کے طلبا نے جمع ہو کر یہ چاہا کہ دُرانی صاحب کالج کے فائونڈر ہیں اس لئے ان کا فوٹو اس کالج میں لگائیں گے قبلہ نے کہا تو جب یہ نام و نمود میرا اِصلہ مقرر کیا جا رہا ہے تو میں یہاں سے چلا جائوں گا۔ اس پر طلبا اپنے ارادے سے باز رہے۔ ہر انسان کی عزتِ نفس رکھنے کا قبلہ کو اتنا خیال تھا کہ ایک بار ایک ویلڈر نے کالج کا کافی سامان چوری کر لیا۔ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے اپنی جان بچانے کے لئے اپنے کیرکٹر کی تصدیق میں قبلہ کا ہی نام پیش کیا۔ قبلہ نے بھی اس کے پچھلے کام کی تعریف کی اور کہا کہ ویلڈنگ کا جو سامان اس کے پاس سے نکلا ہے وہ کہیں سے بھی مل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ویلڈر چھوڑ دیا گیا۔ اس واقعہ سے اس شخص پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے قبلہ کے قدموں پر آ کر سر جُھکا دیا اور بعد میں خود ہی وہ سارا سامان لا کر دے دیا۔ ایک دفعہ لیکچراروں کے درمیان جگڑا ہوا۔ قبلہ نے چشم پوشی کی۔ یہ صاحب قبلہ کے پاس سخت غصہ کے عالم میں پہنچے کہ اگر قبلہ نے ان کا ساتھ نہ دیا تو لڑائی ہو گی۔ قبلہ نے تسلی دینا چاہی تو کہا میں کوئی بات سننے کے

لئے تیار نہیں ہوں۔ پھر قبلہ نے کہا روٹی تو کھالو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر کہا اچھا خوشبو تو سونگھ لے بیوقوف۔ اور ایک شیشی سُنگھا دی۔ دو چار منٹ میں غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ان صاحب نے روٹی کھالی۔ آخر ایک ہی برادری میں تو یہ جھگڑا ہوا تھا۔ سب ایک ہی مقصد کے لئے تو یہاں کام کر رہے تھے۔ قبلہ کے رہائش کی جگہ بنگالی کوٹھی تھی جو بھمولہ گائوں کے قریب تھی۔ اس کوٹھی میں ہر قسم کے لوگ رہ رہے تھے۔ یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کون کون رہتا ہے۔ کہاں کھانا پکتا ہے اور اخراجات کہاں سے آتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کی تعداد کبھی گنی بھی نہ جا سکی۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہاں سے کوئی بھی کبھی بھوکا اٹھ کر نہیں گیا۔ یہ کوٹھی بجائے خود ایک جمعی فلاحی قیام گاہ تھی۔ اسی کوٹھی میں قبلہ کے ساتھ کچھ عرصے ممتاز قریشی مرحوم اور شمیم صاحب کے خاندان بھی رہے۔ یہاں افضل صاحب، دائود صاحب، خواجہ بھائی، پاشا بھائی، منان درانی، احمد محی الدین اور بہت سے دوسرے لوگ مختلف زمانوں میں قبلہ کے پاس ٹھہرتے رہے۔ ملاقاتیوں میں ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ احمد، ڈاکٹر مغنی اکثر آتے۔ یہاں اکثر مسلمانوں، ہندوئوں اور پارسیوں کو بھی قبلہ کی خدمت میں آتے دیکھا خصوصی طور سے ایڈل جی باٹلی والا قبلہ کے پاس آتے تھے۔ یہی قبلہ کے نزدیک ترین دوست معلوم ہوتے تھے اور گھنٹوں ہومیو پیتھی اور تصوف کے مسائل پر قبلہ سے گفتگو کرتے۔ گھر اور کالج کے لئے قرضہ کی اکثر ضرورت پڑ جاتی تو غالباً ایڈل جی ہی پیشکش کرتے۔ یا اُس وقت فوری رقم کی ضرورت ہوتی جب ضرورت مند طلباء کی مدد کے لئے یا یونیورسٹی کے ڈیوز ادا کرنے کے لئے یا تو ضمانت دی جاتی یا نقد رقم مہیا کی جاتی۔ اکثر و بیشتر یہ ضمانت کی رقم قبلہ کو خود ہی ادا کرنا پڑتی۔ قبلہ کے لباس اور طرز رہائش میں بالکل سادگی تھی۔ معمولی کپڑے، ڈھیلے ڈھالے قسم کے استعمال ہوتے جو ورکشاپ کے کام میں بھی آتے۔ شاذونادر ہی سوٹ کسی فنکشن کے لئے پہنتے۔ ساری زندگی صبح سے شام تک ایک انہماک کار میں گزرتی۔ باہر سے دیکھنے والی آنکھیں تو ظاہری وجود کے کاروبار سے زائد کیا دیکھتیں۔ اندر کیا حال تھا کسے معلوم تھا کس جذبہ کے تحت، کس نظریے کے تحت، کس مقصد کے تحت یہ تمام زندگی گزر رہی تھی اس کو معلوم کرنے کی کسے فرصت تھی۔ کالج کے کام، لوگوں کی دادرسی، مختلف قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں۔ تصوف کی مجلسیں ہی کیا کم تھیں کہ خاکسار تحریک میں بھی معہ کافی لیکچرارز اور طالب علموں کے معروفِ کار تھے۔ اس تحریک کا مقصد اللہ کی حکومت قائم کرنا اور اس کا پروگرام، منظم خدمتِ خلق کرنا تھا۔ تنظیم کے لئے پریڈ بیلچہ، کیمپ، آس پاس کے علاقہ میں فلاحی کام، مجبور ضرورت مندوں کی امداد، بنگال کے قحط میں امدادی کام، پھر تقسیم ملک کے زمانہ میں ہنگاموں اور قتل وغارت کے زمانے میں یونیورسٹی اور شہر کی حفاظت کے انتظامات کرنا وغیرہ تھا۔ قبلہ درانی صاحب، سالار سے بھی اوپر خاکسار تحریک کی ہائی کمان کے ممبر تھے۔ لیکن جو کام عام ممبر کرتے یہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو کر ان کاموں میں لگے رہتے۔ ایک جانب کالج کی ترقی کے سلسلہ کے کام جاری تھے دوسری جانب خاکسار تحریک کے سلسلہ میں روز افزوں ذمہ داریاں جس میں یونیورسٹی کے بہت سے طلبا اور پروفیسر سچا جذبہ لے کر شریک کار تھے۔ تقسیم ملک کے وقت جب مسلمان آبادی اور یونیورسٹی پر جنگ سنگھ کے حملوں کا یقینی خطرہ تھا تو راتوں کو حفاظتی پارٹیاں گشت کرتیں۔ پروفیسر شمیم صاحب کے ذمہ انتظاماتِ حفاظت سپرد تھے۔ بندوقوں اور دوسروں ہتھیاروں سے لوگ مسلح رہتے۔ قبلہ نے اس وقت بھی یہ فرمایا تھا کہ میری بندوق سے کوئی نہیں مرے گا میرا انشانہ یہ نہیں کہ اچھا نہیں لیکن میری بندوق کا چھرا کسی کے گھٹنوں سے اوپر نہیں جائے گا۔ اس وقت علی گڑھ کے حالات اتنے خراب تھے کہ لوگ اپنی ہمتیں قائم رکھنے کے لئے تکبیر کے نعرے لگاتے۔ گلیوں اور سڑکوں پر گشت کرتے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک حفاظت کی جگہ میں رات کو جمع رکھتے اور خود پہرہ دیتے۔ ہر ایک کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ قبلہ نے کہا تھا کہ ڈرو مت کچھ نہیں ہو گا۔ جو قوم یا فرد جو چاہتا ہے وہ ملتا ہے۔ اگر مسلمان ڈرتے رہے موت سے، تو یہی ملے گی جس کا خیال کرتے ہیں۔

قبلہ درانی صاحب کو تو سخت بیمار ہو جانے کی وجہ سے علی گڑھ چھوڑ کر اپنے وطن جنوبی ہند جانا پڑا اور ادھر بہت سے لوگ ہنگاموں کے ڈر سے پاکستان چلے آئے۔ قبلہ درانی صاحب کی ریڑھ کی ہڈی میں جو چوٹ لگی تھی اس پر دوبار اور دہلی کے سفر میں تانگوں کے حادثوں میں چوٹیں آئیں۔ ان چوٹوں کو اور کمر کی ہڈی کے زخم کا اور خراب ہو جانا، لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھا۔ مگر کب تک۔ ۴۴ء تک جو جسم میں توانائی تھی وہ کم ہو چکی تھی مگر شدتِ کار کی جو دُھن تھی اس میں ظاہر میں کسی طرح کمی نہ آنے دی۔ اس وقت جو جسم کی حالت تھی وہ کسی اور کی ہوتی تو پلنگ سے نہ اٹھ سکتا اور مکھیاں بھنکتیں مگر یہاں جیسے کوئی اور پوشیدہ قوت اس جسم کو سنبھالے پھرتی تھی۔ قبلہ کے لئے گویا طبعی تندرستی اور صحت معنی ہی نہیں رکھتی تھی۔ آنکھوں میں روشنی، زندگی کی علامت بنی رہی۔ اتنی قوت ارادی صوفیا میں کم ہی دیکھنے میں آئی ہے اور یہی ارشاد ایک جیّد بزرگ صوفی نذیر احمد کاشمیری کا تھا جن کی صحبتوں میں قبلہ اکثر بیٹھتے۔ علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے قبلہ کی کمر کی ہڈی کے تین مُہرے گل گئے۔ بابا تاج الدینؒ نے بھی ناگپور میں تین کے ہی مارے تھے وہ تین مکے اور یہ تین مُہرے ایک ہی داستان میں منسلک ہو گئے۔ اس حالت میں بھی کالج میں میز پر لیٹے لیٹے دوسروں کو ہدایات دیتے رہے اور کالج کا کام برابر جاری رہا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے قبلہ کا یہ جنونِ خدمت دیکھ کر خود ہی قبلہ کو مجبور کیا کہ آرام کرنے اپنے وطن جائیں اور ان کی روانگی کے انتظامات خود کر دیئے پھر جب حضور بابا قادر اولیاء کے دربار سے فیض یاب اور صحت یاب ہو کر دوبارہ نومبر ۴۹ء میں قبلہ علی گڑھ پہنچے تو ہندوئوں نے پوری میڈیکل بورڈ کرائی جس میں جمناسٹک شامل تھی۔ بابا قادر اولیاء نے پہلے سے فرمادیا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ جب قبلہ سے مختلف قسم کی ورزشیں ڈاکٹر نے کرائیں تو قبلہ ایک مدہوشی کے عالم میں اپنے سامنے ایک پُتلے کو دیکھ رہے تھے اور جیسے جیسے وہ پتلا حرکت کرتا تھا ویسے ہی یہ کرتے۔ اس طرح یہ ٹوٹی ریڑھ کی ہڈی والا جسم بھی میڈیکل ٹسٹ پاس کر گیا۔ یوں طلبا نے بھی ڈاکٹر کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر اس نے قبلہ کے لئے رکاوٹ ڈالی تو اس کی خیر نہیں۔ مگر ڈاکٹر بھی اس راہ میں کیا رکاوٹ بن سکتا جو بہ فیضانِ شیخ، مقرر ہو چکی تھی۔

قبلہ کے ساتھ یہ چند سال گزارنے کی اسپرٹ تھی جو پاکستان آنے کے بعد بھی غلام کبریا صاحب نے لاہور میں ملی تیکنیکی ادارہ قائم کیا۔ یہاں مفت تکنیکی تعلیم کا انتظام تھا اور یہاں سے ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ کے چھ ڈویژنل انجینئر اور سینکڑوں لائن مین واپڈا اور بنگال میں کام کرنے کے لئے فارغ التحصیل ہوئے۔ کبریا صاحب کے ذہن میں وہ علی گڑھ کا جذبہ تھا کہ جو چیز قبلہ نے علی گڑھ کی وہ میں یہاں کیوں نہ کروں۔ حال ہی میں ان صاحب نے قبلہ سے موزوں یا سادہ ٹیکنالوجی کی اسکیم کی اجازت لی ہے۔ قبلہ کے ساتھ زندگی کا ماحصل انہوں نے یہی پایا ہے کہ انسان کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔ بلکہ جو بھی سامان اور وسائل موجود ہوں ان کو استعمال کر کے زندگی کو فروغ دینا چاہئے۔ ہمیں مہدی کے انتظار میں کیا بیٹھنا ہے آخر اپنی زندگیوں میں بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ بجائے روتے بیٹھنے کے آپس میں مل کر سوجھ بوجھ سے اسی ہنر کو استعمال کرنا چاہئے جو آتا ہے۔ زندگی ساری کی ساری ایک ہی توحید میں ہے۔ کیا انفرادی، کیا اجتماعی، کیا فقیری، کیا انجینئری۔ کیا خاکساری، کیا پالیٹکس۔ انسان چاہے تو گھودے پر سے بھی موتی چن سکتا ہے۔ معمولی انسان سے، عظیم جمعیت بنا سکتا ہے۔ کباڑ کے سامان سے نہ صرف مشینیں ایجاد کر سکتا یہ بلکہ موجدوں کی بھی ایجاد کر سکتا ہے۔ تائید غیبی یہی ہے کہ انسان ان صلاحیتوں سے کام لے جو اس کے غیب میں ہیں۔ نہ شکوہ شکایت کی گنجائش ہے نہ کسی کی بُرائی اور تنقید کی۔ نہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتا ہے نہ منفی خیالات دل میں لاتا ہیں۔ جب ''ہے'' تو ''نہ'' کی گنجائش کہاں۔

یوں ایک مفکرانہ نظر سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ زندگی میں لگن ہو، اٹھان ہو، مقصد کا تعین ہو، تب ہی صحیح معنوں میں حیات، حیاتِ انسانی کہلائی جاسکتی ہے۔ خلوص، محبت، بے لوث خدمت کے جتنے بھی لمحے انسان کو میسر آجائیں وہی زندگی کا سرمایہ ہیں، وہی نعمتِ ابدی ہیں۔

جمعی فلاحی جمعیت کے انداز میں عمل پیرائی جہاں فطری شوقِ نمود اور ازلی بے چینی کو ایک رُخ عطا کرتی ہے وہاں اندر کی آگ کو بھی سکون بخشتی ہے۔ اس طرح ایک طرف انفرادی وجود کی ہر ناپسندیدہ منفی صفت کی لا بھی ہو رہی ہوتی ہے اور دوسری طرف باطنی حقیقتوں کو بھی حی و قیوم کی راہ ملتی ہے۔ وجود تو یہی مٹی کا ہوتا ہے مگر باطنی صفاتِ حمیدہ رحمت کے مثبت انداز میں کاروبارِ جہان میں عمل پذیر ہو کر ظاہری وجود کا بھی حسن بن جاتی ہیں۔ گندم از گندم بروید جَو زِ جَو۔ یوں انسان صرف زبانی ورد و ظائف سے اپنے گناہوں کا استغفار کیا کر سکتا ہے۔ لغزشوں اور غفلتوں کا کفارہ اچھے اقدامات کر کے ہی ادا کیا جاسکتا ہے یا دوسروں کو یہ عملی راہ دکھائی جاسکتی ہے۔ مثلاً کسی کا مال غصب کیا تو غریبوں کی دادرسی کر کے ہی اس کی ادائیگی ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی کا مال غصب کیا تو غریبوں کی داد رسی کر کے ہی اس کی ادائیگی ہو سکتی ہے۔ کسی کو مارا پیٹا تو، اب مظلوموں کی پشت پناہی کر کے ہی انہیں ظلم کے پنجوں سے چھڑانا ہوتا ہے یا نفسا نفسی میں زندگی گزاری ہے تو بے لوث خدمت میں ہمہ تن مصروف ہی رہ کر اپنے کو بھول جانا ہوتا ہے اس طرح ہر فرد کو زمین کی بات زمین کی سطح پر اور آسمانوں کی بات آسمانوں کی سطح پر نبھانی ہوتی ہے عقائد میں ایک وحدت ہو، اکائی ہو، توحیدی انداز ہو تو اعمال میں دوئی کہاں ہو سکتی ہے۔ مادہ، جسم، ذہن، عقل، خواہش، نفس وغیرہ کی سطحات کا استغفار، زمین کی سطح کی بات ہے۔ جو دارالعمل ہے اور آسمانوں والی بات، لطافتوں سے ہمکناری ہے۔ یہاں تسبیح والا استغفار ہے جو مقامِ سبحانیت میں رسائی کے بعد ہی کوئی معنی رکھ سکتا ہے۔ پھر اس سے کہیں آگے استغفارِ وجود ہے۔ جو کُلی طور پر اپنے وجود کے حجابوں سے مغفرت اور آزادی ہے۔ جو کُلی طور پر اپنے وجود کے حجابوں سے مغفرت اور آزادی ہے۔ یہی عبدیت کا مقام ہے۔

اس منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ طویل اور لمبا سفر طے کرنا ہوتا ہے جس میں ایک بیقرار روح، اپنے اصل کی تلاش میں کوچہ کوچہ، قری قریہ گھومتی ہے۔ ایک نہ بجھنے والی علم و عرفان کی پیاس اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک لئے پھرتی ہے۔ یہ تنہائیوں کا سفر صبر آزما ہی ہوتا ہے اور روح فرسا بھی۔ بابا تاجؒ کے وصال کے بعد تئیس سال قبلہ کو یہ تنہا سفر کرنا پڑا۔ اپنے جسم و جاں کی تجربہ گاہ میں یہ حقیقت معلوم کرنی تھی کہ حقیقت کیا ہے، حق کیا ہے۔ حق تک رسائی کے لئے لوگوں کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں آخر یہ تو اب تک صاف نظر آرہا تھا کہ قدرت کی عطا وہ غیبی صلاحیتیں جہاں جسم و عقل کی سطح پر کار فرما ہیں، وہاں مقامِ قلب و روح پر ان کی کہیں زیادہ عمل پیرائی ہے۔ یہ لطافتوں اور مجردات کی دنیا، ساری خلقت کو ایک ہی نفسِ واحدہ کی صورت میں پیشکر رہی تھی۔ باطن کے چراغ روشن تھے۔ مجاہدوں اور ریاضتوں کے طریقے بھی اختیار کر کے دیکھے۔ نفس کُشی اور اپنے جسم پر طرح طرح کی سختیاں کرنے کا ہندو یوگیوں کا طریقہ بھی آزمایا۔ وہ یوگیوں کا عرصہ تک ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا یا ایک ہاتھ اٹھا کر اسے خشک کر ڈالنا۔ حبس دم کر کے عمریں بڑھالینا یا دھوپ اور موسم کی سختیوں میں اپنے جسم کو ایک بھٹی میں سے گزارنا۔ یا مٹھیوں کو اتنا سخت بھینچ کر عرصہ تک بیٹھ جانا کہ ناخن بڑھ بڑھ کر ہتھیلیوں کے پار نکل جائیں مگر ان شعبدہ بازیوں کا یہی انجام نظر آیا کہ یہ سب غیر فطری طریقہ ہے۔ اس سے شاید وہ لطافت تو حاصل ہو جاتی ہے کہ سیر ارض کر لیں۔ ہوا میں اڑ کر دکھا دیں۔ مگر ان کی حقیقت سوائے نفس کی طاقتیں حاصل کر لینے کے اور کیا تھا۔ نہ ان طریقوں میں حقیقت کی جھلک مل سکی۔ نہ کوئی دائمی اقدار جو مرنے کے بعد بھی قائم رہتیں۔ یا جن سے حیاتِ روح حاصل ہوتی۔ یہ تو سب کچھ جسم و جان اور اس زندگی کے دھندے تھے۔ یہ زندگی ختم ہوئی اور ابدی موت۔ نہ ان کی روحوں کا کچھ پتہ نہ ان کے مزارات یا چلہ کشی کی جگہوں سے بعد میں آنے والوں کو کوئی فیضان مل سکا۔

اس تپسیا اور سخت کوشش میں سے گزرنے کے بعد بالآخر گوتم بدھ نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ موت و زیست کے چکروں، آواگون سے نجات اور مکتی حاصل کرنے کے لئے ایک پاکباز زندگی، عاجزی، مسکینی اور توکل میں گزارنے کے بعد انسان کو نروان ملتا ہے۔ اُس نے شاید حقیقت کی جھلک بھی پالی۔ روحِ اعظم کی سطح تک بھی رسائی ہوئی۔ مگر جس بیقرار روح کو مردہ سکون کی جگہ ایک عشق کی وارفتگی ایک بے قراری، ایک فروغِ کن کی سرشاری نصیب ہو، وہ مکتی اور نجات کی تو کیا پرواہ کرتا یا اس فکر میں کیا رہتا کہ آتما، پرماتما سے مل جائے یعنی رُوح، حق سے مل جائے۔ جن زندہ روحوں میں حی و قیوم کے انوار تابانی دینے لگیں وہ سکون یا نروان یا وصال حق میں کہاں اپنے کو گم کر دینے یا ضم کر دینے کا تصور لائیں۔ اُن کو ان تمام ساکن منازل سے گزر جانا ہے۔ انہیں تو ہر منزل کی لا کرنی ہے۔ نفس کی لا، قلب کی لا، روح کی لا یہاں تک کہ توحید فی الترکِ توحید اور بالآخر ترکِ ترک۔ البتہ ان فنائوں کے بعد بقا ہے۔ لا الٰہ کے بعد الا اللّٰہ میں بقا اور محمد الرسول اللّٰہ میں قیام۔

خیر یہ منازل تو ابھی بعد کی باتیں تھیں۔ اس اٹھتی جوانی کے زمانہ میں تو قبلہ کو وہ سارے تجربات اور مشاہدے کرنا تھے جن سے گزر جانا آسان بات نہیں ہوا کرتی۔ کوئی کسی جگہ تجلی دیکھ کر اسی میں عمر گزار دیتا ہے، کوئی انعامات و اکرامات حاصل ہونے پر ان ہی میں گھر جاتا ہے۔ کوئی مختلف قوتوں کو حاصل کر کے اُن ہی کو اپنی منزل سمجھ بیٹھتا ہے۔ یوں بھی فقراء یا ہندو یوگی کسی کو اپنے قریب اتنا کہاں لاتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی گھس کر جھانک سکے۔ ہندو طریقۂ تصوف کو قریب سے دیکھنے اور آزمانے کی اس لئے ضرورت تھی کہ مقامِ امر میں ان کے دخل کی حد معلوم کی جاتی اور یہ بھی معلوم کیا جاتا کہ یہ لوگ بھی عالمِ مثال میں دسترس رکھ کر کس طرح کاروبارِ عالم کو ایک رُخ دیتے ہیں۔ آخر ہمالہ کی پہاڑیوں پر دریائوں اور سمندروں کے کنارے گھنے جنگلوں، تاریک غاروں میں جا کر یہ لوگ کیوں بیٹھ جاتے ہیں؟ فرد اور قوم کی سطح پر یہ لوگ پیرا ہیں کس طرح۔ اور اپنے اسلامی تصوف کی کس سطح سے ان لوگوں کے اثرات کو زائل کیا جا سکتا ہے؟

ہندو مذہب کے چیلوں کو یوں بھی مسلمان کا سایہ اپنی مقدس جگہوں، عبادتوں اور ریاضتوں کے مقامات پر دیکھنا کب گوارا ہوتا ہے۔ ان کے بعض مندروں میں تو داخل ہونے کی اتنی سخت پابندی ہے کہ اگر کوئی مسلمان غلطی سے بھی ادھر قدم رکھ دے تو قتل کر دیا جائے قبلہ جہاں عام جگہوں پر گئے وہاں ان جگہوں کو دیکھنے اور ان کا جائزہ لینے کا شوق تو اتنا تھا کہ جان جوکھوں میں ڈال کر جانا بھی نہ چھوڑا۔ بڑے بڑے مہنتوں اور رشیوں سے دور دراز مقامات میں ملاقاتیں کیں۔ اسی شوق میں ایک دفعہ اُن کی شرائط کے تحت شُدھی ہونے کا ڈرامہ بھی کھیلا۔ مگر ارنا چلم (جنوبی ہند) کا وہ مندر ضرور دیکھا جس میں داخلہ سوائے ہندوئوں کے ممنوع ہے۔

الغرض قبلہ نے اس قوم کی عمل پیرائی فراستِ عقل کی سطح پر بھی دیکھی اور پرکھی، نفس کُشی کی سطح کا عروج بھی آزمایا۔ ان کی روحانی طاقتوں اور تصرفات کو بھی جانچا اور اُن کی خشک توحید کا بھی علم و عرفان حاصل کیا۔ تفصیلات کو پسِ پُشت چھوڑ کر دو ایک واقعات کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ اس سے ایک ہلکی سی جھک اس قوم کے فکر و عمل کی شاید مل سکے گی۔ فراستِ عقل اور ذہن رسا کی لامحدود وسعتوں کے تماشے یہ لوگ بہت سے دکھا لیتے ہیں۔ مثلاً جنوبی ہند میں ایک شخص سو لوگوں سے مختلف کھیلوں کی بازیاں لگا کر مقابلہ کرتا تھا۔ کہیں شطرنج کی کئی کئی بازیاں لگی ہیں کہیں لُوڈو، ڈرافٹ اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں کی۔ اسی طرح ایسے بھی دیکھے جو ایسے ایسے جادو، ٹونے ٹوٹکے کر کے دکھاتے ہیں جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اسی قسم کے ایک شخص نے جس نے کالی کی پُوجا سے یہ شکتی (قوت) حاصل کی تھی قبلہ پر اپنے عمل کا کرتب دکھانا چاہا۔ قبلہ سامنے بیٹھ گئے۔ اُس شخص نے بہت کچھ پڑھا مگر اثر نہ ہوا تو اس نے قدموں میں سر ڈال دیا۔ اور منت سماجت کی کہ مجھے اسی حال میں رہنے دیں۔ میں

ازلی بدبخت ہوں۔ اس کا نام علی بابا تھا اور سادات سے تھا۔ یہ شخص بابا تاج الدینؒ کے دربار میں بھیعرصہ تک رہ کر روحانیت میں اپنی دسترس نہ پا کر، اسی گمراہی میں پڑ گیا تھا اور کالا جادو سیکھا تھا۔ قبلہ کی یہ نوعمری کا زمانہ تھا مگر چونکہ بابا تاجؒ کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے اس کے شر سے محفوظ رہے اور وہ خود قدموں میں آ گرا۔ اسی طرح کئی شعبدے باز سادھوئوں سے سابقہ ہوا مگر اس تمام خرافات سے کیا حاصل جسے لوگوں نے روحانیت کا نام دے رکھا تھا۔ ان راہ کھوٹی کرنے والوں سے دامن بچا کر گزر جانا ہی شرفِ انسانیت تھا۔ گو ان لوگوں میں قبلہ نے ایسے لوگ بھی دیکھے جو تنہائیوں میں یا ہمالہ کی پہاڑی پر بیٹھے ہیں۔ عمریں بھی بڑھالی ہیں۔ شانت بھی ہیں۔ ایک قسم کا سکون بھی حاصل کئے ہیں۔ ان ہی میں ایک راونا مہارشی تھے جو صرف خصوصی دنوں میں اپنے غار سے باہر آ کر بیٹھتے۔ کسی سے بات نہ کرتے کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب پرچہ پر لکھ کر دیتے۔ قبلہ نے اُن سے دریافت کیا کہ آخر اس نفس کُشی، اس تارک الدنیا ہونے سے کیا حاصل۔ آخر آپ دنیا کے لئے کیا عمل کر رہے ہیں تو اس نے جواب دیا تھا کہ ہمارا دائرہ عمل دل کی سطح سے ہے یہ نہیں کہ ہم کسی سے بات کریں۔ بس ہم شانتی کی لہریں زمانہ میں نشر کرتے ہیں تو شانتی رہتی ہے۔ ایسے ہم دوچار ہی اگر ہو جائیں اور یہ کریں تو دنیا میں جنگیں نہ ہوں اسی طرح ہم کسی قوم کے لیڈر کے ذہن میں اپنے خیالات نشر کر کے اُس قوم کی راہِ عمل مقرر کر سکتے ہیں۔ اس رشی سے قبلہ کو اپنی آئندہ زندگی کے لئے، اس راہ میں کچھ دسترس حاصل کر لینے کے بعد اپنے لئے بھی راہِ عمل نظر آئی۔ قبلہ کو معلوم تھا کہ نورِ محمدیؐ سے یہ لوگ محروم ہیں اسی لئے ایسوں کا دائرہ عمل محدود ہے۔ خشک توحید اور زمانے سے ایکائی سی انہیں ضرور حاصل ہے۔ مگر رحمتِ محمدیؐ سے یہ لوگ محروم ہیں۔ رحمتی وُسِعَ کُلِّ شیئٍ والی بات ہے اس کے رابطے کے بعد، رحمت کے نشر سے، مسلمان قوم کے کام بن سکتے ہیں۔ کُن کے فیضان سے، عالمِ امر سے کار فرمائی کرنے سے یہ لوگ محروم ہیں مگر مسلمان کو یہ امر نصیب ہے۔ پہنچے تو صاحبِ امر کے مقام تک۔ پھر جمعی کوشش والی بات، کہ چند ایک مل کر یہ شانتی اور سکون کی لہریں اپنے اندر اپنا کر زمانہ میں نشر کریں، قبلہ کو ایسی بھائی کہ عالمِ امر پر بھی جمعیت بندی اور ایک توحید فکر مسلمان فقراء میں قائم کرانے میں اس امت کے آئندہ فروغ کی راہ دیکھی۔

اس لئے یہ ظاہر یہ ہندوئوں، فقیروں، سادھوئوں، رشیوں کی صحبتوں میں وقت گزارنا نہ ایک بہک جانا تھا۔ نہ اپنی راہ کھوٹی کرنا تھا۔ نہ اندھیروں میں راہ ٹٹول کر چلنا تھا۔ نہ روحانیت کی قوتیں حاصل کرنا تھا بلکہ اس کے پیچھے بھی وہی قومی ورد تھا جس میں اس بھولی بھٹکی قوم کو ایک راہِ عمل، ایک نصب العین کی نشاندہی کرانا تھی۔ دین نہ کتابوں میں تھا نہ چند ارکان کی ظاہری پابندی کر لینے میں۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ اس حقیقت کا نہ صرف عرفان کرنا تھا یا اسے اپنے میں سمو کر بیٹھ جانا تھا بلکہ خود بھی اس منزل پر پہنچ کر اس کے نشر کا ذریعہ بننا تھا۔ اب ایک نئی راہ کی نشاندہی قلب و دماغ کے کسی گوشے میں قبلہ نے ڈال کر آگے کی منزل کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ راہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی تھی کہ جمعیت بندی، توحید فکر۔ ہر سطح پر قوم کو نصیب ہو۔ جسمانی سطح پر، ذہنی سطح پر عوام کو اور قلب و روح کی سطح پر، امر کی سطح پر بھی وہی توحید فکر فقراء میں، اور اُن ارواحِ مقدسہ میں جو پس پردہ عالمِ بالا سے بھی اس امت کے انفرادی اور اجتماعی کاموں میں عمل پیرا ہیں۔ اب قبلہ نے اسی نظریے اور اسی خیال کو لے کر اپنی آئندہ زندگی میں کوشش کرنے کی ٹھانی۔ منزل ابھی بہت دُور تھی ابھی تو اپنے فقر کی ابتدائی منازلیں ہی بابا تاجؒ کی شفقت اور پشت پناہی میں گزری تھیں۔ آگے کی فکر اب جو لگی وہ بس یہی تھی کہ حقیقت کو سمونا اور اس کو نشر کرنا اور اس کے بعد فقراء اور ارواح مقدسہ میں توحیدِ فکر قائم کرا کے امت کو فروغ کی راہ پر ڈالنا ظاہر ہے کہ ابھی تو پہلی ہی منزل درپیش تھی یعنی حق کو سمونا۔ بغیر راہبر کے یہ منزل بھی کیسے پار ہوتی۔ اسی لئے فقیر فقراء سے ملاقاتوں کا شوق

اور بھی بڑھ گیا کہ راہ روانِ جادۂ حق کے ذریعہ ہی حق کی راہ ملنا آسان تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی طے تھا کہ نہ کہیں قیام کرنا ہے نہ تھوڑے سے ہی کو حاصل کر کے ان مقامات کے لوگوں میں اُلجھ کر وہیں کا ہو رہنا ہے۔ بلکہ وہی منزلِ معراج امتی امتی۔ حیاتِ امت۔ فروغِ امت

چلتا ہوں دو قدم ہر اِک راہ رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

علی گڑھ کے قیام کے دورانِ قبلہ نے ایسے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہم مجلسی اور رابطہ رکھا جو فراست و دانائی کے علاوہ حُسنِ اخلاق کا نمونہ تھے۔ ان صاحب دانش لوگوں میں نہ عقل کی بخیہ گری تھی نہ فراست کی عشوہ گری۔ اُن کی زندگیاں سادہ تھیں۔ اُن کے دل جذبۂ خدمتِ قوم سے لبریز تھے۔ ان میں سے ہر ایک مخصوص مکتب علم و فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ یوں تو قبلہ کی وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین سے لے کر سارے ہی پروفیسروں سے اچھی راہ و رسم تھی مگر جو لوگ قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ ان میں ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ احمد، ڈاکٹر مغنی، ڈاکٹر ذکی الدین، پروفیسر شمیم، پروفیسر کرار حسین اور اختر حمید صاحب قابل ذکر ہیں۔ قوم کو ایک نصب العین کی روشنی میں، فروغ کی راہ پر گامزن کرانا دانشوروں کا حصہ ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر احمد فلسفہ کے ماہر، ڈاکٹر مغنی سائیکولوجی، ڈاکٹر ذکی فزکس، پروفیسر شمیم کیمسٹری، پروفیسر کرار حسین اقتصادیات اور اختر حمید صاحب معاشیات میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ علم و عقل کی ظاہری سطح سے دیکھا جائے تو سب کے سب ایک ہی جسم کے اعضاء ایک ہی توحید فکر میں زندگیاں گزارنے والے نظر آتے تھے۔ یہ سب ایک ہی جذبہ سے سرشار تھے کہ نئی نسل کو تعلیم و ہدایت کی وہ روشنی عطا کی جائے جو مستقبل میں قوم کے مختلف زندگانی کے پہلوئوں کو مستحکم کرنے کی ضمانت بنے۔ ان لوگوں کا یہ خلوص ان کی نجی زندگیوں میں بھی ان کی انفرادی آب و تاب کی ضامن بن گئی اور ان کی صحبت اور تعلیم سے جن لوگوں نے فیضان اٹھایا وہ خود ان کا سا تاثر، ان کی سی عقل و دانش، ان کا سا عقل و تدبیر ان کی سی قلب و روح کی صلاحیتوں سے مستفید ہوئے۔ اس طرح وہ لوگ بھی ان کے مقناطیسی حلقۂ اثر میں آکر، دین و دنیا کو توازن میں لئے زندگیاں گزارنے اور اس روشنی باطن کو نشر کرنے میں دوسروں کے لئے نمونہ بنے اور صاحبانِ عقل و دانش نے یہ جان لیا کہ اپنی ذہنی، جسمانی، قلبی، روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہی حق زندگی اور شکرانۂ بندگی ادا ہو سکتا ہے۔ اس سے آگے حق کا عرفان یا حقیقت تک رسائی البتہ ہر فرد کے لئے اس کی انفرادی یکتائیت ہی پر منحصر ہے۔ اور ہر فرد اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ہی یقین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ حق بندے کے گمان کے مطابق ہی ہے۔ جیسا سوچو گے، حق ویسا ہی ہے۔ حاضر سمجھتے ہو تو حاضر ہے ھوالظاہر ھوالباطن، سمجھتے ہو تو ایسا ہی ہے۔ ھوالاول ھوالاخر سمجھتے ہو تو ایسا ہی ہے۔ اللہ نور السمٰوات سمجھتے ہو تو ویسا ہی ہے۔ رحمن، رحیم، حی، قیوم، قدوس الغرض ۹۹۔ اسمائے ذاتی کی جھلکیوں میں سے جو بھی اپنے مقدر، اپنے اندر ودیعت شدہ صلاحیتوں کی روشنی میں اپنے پر تجلی دے جائیں۔ یہ سب کے سب وہ تھے جو محض علمی عقیدہ کی بنا پر کسی چیز کو مان لینے کی بجائے تفکرون کے قائل تھے۔ ایک سائنسی اور تحقیقی نکتۂ نگاہ سے ہر شے کو پرکھنے اور ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر کسی نتیجہ پر پہنچنے کو افضل سمجھتے تھے۔ البتہ عام عقل و دانش کی حدود سے پرے وہ چھٹی حس، نورِ عقل، القا کو بھی ایک مقام اپنی زندگیوں میں دے کر رَبِّ زِدنی علماً و فھماً کی وجودی تصویر بن گئے تھے۔ کیونکہ بغیر فہم کی حد تک پہنچے انہوں نے ہمیشہ علم کو تشنہ ہی پایا۔ ان لوگوں کی مجلسوں میں اکثر دقیق مسائل پر ہی گفتگو رہتی۔ اس طرح ان کا ذہن رسا ایک دوسرے کی منجھائی اور صفائی کا ذریعہ بنتا رہا۔ گویا صاف شفاف موتی ایک دوسرے سے گھِس گھِس کر، روز نت نئی آب و تاب نکال رہے تھے۔ ان صحبتوں کے درمیان جہاں ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی راہ تعین کر لی وہاں قبلہ نے بھی علم و دانش کے محدود حدوں سے پرے القاء نور عقل، علمِ لُدنی کی راہیں تلاش کرنا شروع دیں اور اپنے ذاتی عروج سے کہیں زیادہ

جمعی فلاح، جمعی فروغ کی اہمیت کو سمجھا۔ فرد کو فنا تھی، جمعیت کو بقا۔ اسی نصب العین، اسی جمعیت کے فروغ کے لئے، ہر انسان کے اُن باطنی سر چشموں کو کشادہ کرنا تھا، جو قدرت نے اُسے ودیعت کئے ہیں۔ گویا فروغِ ظاہری کے لئے ارتقاء باطن کو ضروری سمجھا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران فقیر فقراء کی صحبتوں میں اکثر قبلہ کی راتیں گزرتیں۔ ان میں سے خصوصی طور سے قابل ذکر وہ وارثی فقیر تھے جنہیں اکثر علی گڑھ والوں نے یونیورسٹی جانے والی سڑک پر آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ کپڑے زعفرانی، لانبے زلفوں والے بال، خوبصورت سفیدی مائل داڑھی، ننگے پیر، سُبک رفتار، یہ فقیر صاحب اکثر حضرت وارث علی شاہ کے قصے سناتے بیدم شاہ اور عنبر شاہ کا کلام پڑھتے۔ ان وارثی لوگوں کی محبت، عجز، سادگی دیکھ کر قبلہ کو رشک آتا۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے کنارہ کشی۔ جیسے کیچڑ میں پاؤں ہوتے ہوئے بھی کیچڑ پاؤں پر نہ لگے۔ یہی کچھ تو حضرت وارث علی شاہ صاحب نے ابھی اکثر دکھایا تھا کہ کیچڑ میں سے گزر کر آئے ہیں، سفید چاندنی پر آکر بیٹھ گئے اور چاندنی پر پیروں کے نشان نہ پڑے۔ ان ظاہری نشانیوں کے پیچھے قبلہ نے وہ باطنی نشانیاں بھی پکڑ لیں اور اپنالیں جو پس پردہ حقیقت میں تھیں جو حقیقی باطنی پاکیزگی حاصل کر چکا ہو اس پر یہ دنیاوی آلودگیاں کوئی اثر نہیں کر سکتیں۔ پھر اس حسن باطن والے سلسلہ کے صاحبِ سلسلہ وارث علی شاہ صاحب کا حُسنِ باطن دیکھنے کا شوق اور بڑھا۔ بشارت میں قبلہ نے دیکھا کہ ایک نہایت مرصع، نورانی چلمن ہے۔ جس کی خوبصورتی اور حُسن دیکھ کر ہی انسان اتنا مسحور ہو کہ چلمن کے اندر کیا جھانکنے کی تاب۔ جس کی چلمن اتنی خوبصورت ہو وہ لیلیٰ کتنی خوبصورت ہوگی۔ اندر جھانکا تو وہ نور کا سراپا دیکھا کہ آج بھی اس کے تصور سے، روح میں ایک ہیجان بپا ہو جاتا ہے۔ بے حجانہ دیدار کی تاب لانا بھی آسان بات نہیں۔ نورِ محمدؐ، گیسوئے محمدؐ، خوشبوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ کعبہ کا کعبہ روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

علی گڑھ میں کشمیری بابا کے ساتھ اکثر محفل رہتی۔ فقیری، قوالی، معرفت کی باتیں خود بیتے احوالوں کی داستانیں۔ ان کشمیری بابا کے بہت سے معتقد بھی تھے۔ اور بہت سے فدائی پھر ان بابا کو ان کے مرشد نے بشارت میں حکم دیا کہ کشمیر جا کر بیٹھیں۔ انہوں نے بار بار بشارتوں کی پرواہ نہ کی اور طُرفہ تماشہ یہ کیا کہ شادی کرنے روانہ ہو گئے۔ واپس آئے تو حکم عدولی کی یہ سزا ملی کہ خدا معلوم کیا ہوا کہ ان کے مریدوں اور معتقدوں نے مل کر اتنا پیٹا کہ ٹانگیں بھی توڑ دیں۔ اب یہ برسوں سے کسمپرسی کے عالم میں پڑے رہتے۔ قبلہ کو ترس آتا بابا قادر اولیاء کے یہاں دجیا نگرم حاضر ہوئے تو بہت منت سماجت سے کشمیری بابا کی سفارش کی۔ بابا جان نے آنکھیں بند کر لیں پھر کھولیں تو نہایت قہر آلود انداز میں فرمایا۔ ”دیکھو جی عبید اللہ! تم کسی کے معاملہ میں دخل اندازی مت کیا کرو۔ ایک در سے ٹھکرایا تو سارے دروں سے ٹھکرایا جاتا ہے۔

علی گڑھ میں قبلہ خصوصی عقیدت کے ساتھ مولانا سلیمان اشرف کے پاس بھی حاضر ہوا کرتے۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ مولانا دن میں کٹر مولوی اور رات کو مست فقیر ہوتے تھے۔ قبلہ سے ان کی ملاقات اکثر تنہائی میں رات کے وقت ہی ہوتی۔ اس وقت مولانا ایک مستی کے عالم میں ہوتے تھے۔ مثنوی کے شعر پڑھتے، گاتے، جھومتے، رقص کرتے۔ حالت ہی کچھ عجب ہوتی تھی۔ اسی لئے مولانا کا یہ انداز قبلہ کے رگ و جان میں سما گیا۔ اندر سے خسرو جیسا سوز اور باہر سے ہوشمندی عقلمندی۔ مولانا کو بھی قبلہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اکثر غالب یا مثنوی کے کوئی شعر سُنانے کو کہتے۔ خود شعر پڑھتے۔ سر دُھنتے۔ عمامہ اتار ڈالتے۔ کھڑے ہو کر رقص کرنے لگتے۔ علی گڑھ میں بہت ہی شاذ و نادر لوگوں کو مولانا کی اس خصوصی کیفیت سے شناسائی ہوگی۔ مولانا کا یہ انداز کہ دن دنیا کا، رات یار کی، قبلہ کی زندگی کا بھی سرمایہ بن گیا۔ دن میں مولانا، عوام کے آگے ایک ماہرِ فن عالم، متقی، پارسا، شرع و آئین کی پابندی کا مجسمہ بن کر پیش ہوتے۔ دن کا کوئی وقت ایسا نہ ہوتا جو درس و تدریس عبادت و ریاضت میں صرف نہ ہوتا ہو۔ کبھی

محفل میلاد ہوتی تو مولانا خود تقریر فرماتے۔ علم و عرفان، عشق و محبت کا ایک دریا بہا دیتے۔ پھر جب سلام ہوتا۔ قدم مبارک، موئے مبارک کے تبرکات باہر نکالے جاتے تو حاضرین شاہد ہیں کہ محفل پر انوار کی بارش ہوتی ملائکہ کا نزول ہوتا۔ سرکار کی سواری تشریف لاتی۔

اسی زمانہ میں صوفی نذیر احمد سے قبلہ کی ملاقاتیں رہتیں۔ صوفی صاحب، ایمان کا پہاڑ ہیں۔ جن سنگھیوں کا مجمع ہو یا کرپان نیزے اور تلوار کھولے سکھوں کا۔ صوفی صاحب کو جب بھی جوشِ ایمان آتا ان لوگوں کے جلسوں میں بے خطر چلے جاتے۔ لوگ اس غیر معروف اور کُھلے مسلمان شخص کو روکتے تو صوفی صاحب پاسبانوں کو ہٹاتے، دندناتے، اسٹیج پر آدھمکتے کہ مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ اگر کوئی موقع نہ دیتا تو خود کھڑے ہو جاتے اور وہ وہ صلوٰتیں سناتے کہ وہ دنگ رہ جاتے۔ اُن ہی کی کتابوں کے حوالے سے انہیں قائل معقول کرتے۔ شرمندہ کرتے اور چلے آتے۔ رات کو سوتے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ایک نور کا کھمبا، سینہ سے اُبھرا ہے جو چھت سے گزر کر آسمان تک گیا ہے۔ کھانا کھاتے تو ایسے شوق اور انہماک سے جیسے ایک ایک نوالہ محبوب اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا ہے۔ یہ ہیں صوفی صاحب، شکرانۂ بندگی کی چلتی پھرتی تصویر۔ استغفارِ وجود کی تفسیر۔ ایمانِ محکم کی کھلی شمشیر۔ کلمۂ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی نورانی تنویر۔

قبلہ کو اکثر دہلی قلندر عبد السلام کے یہاں حاضری دینے کا شوق ہوتا۔ قلندر صاحب نجیب الطرفین سادات میں سے تھے۔ علومِ دینی، درسِ نظامی، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ کے ماہر۔ ایک بحر العلوم اور ساتھ ہی گنج العلوم۔ معرفت کا خزانہ۔ فقیر۔ قلندر۔ چار موصاف اور حضرت بو علی قلندرؒ سے نسبت رکھنے والے، وہ گرجتی آواز۔ وہ بے مہابا تقریر ایک دریائے رواں کی طرح گھنٹوں بولتے۔ علم و معرفت و حقیقت کے دفتر کے دفتر۔ بیان فرماتے۔ قبلہ بھی اس گنج العلوم سے سیر اب ہونے اکثر قلندر صاحب سے ملاقات کرنے شفقت سے پیش آتے۔ بہت کچھ دینا چاہتے تھے۔ ایک دفعہ بسم اللہ کی تفسیر فرمانی شروع کی تو ۲۷ گھنٹے یہ تفسیر ختم نہ ہوئی۔ ریل سے جانے لگے تو ساتھ ساتھ قبلہ پلیٹ فارم پر بھاگتے رہے اور یہ تفسیر جاری تھی۔ پھر ڈھائی سال تک لا الہ کی تعلیم دیتے رہے۔ قبلہ نے عرض کی کہ کوئی ایسا شخص دکھا دیجئے جس نے اپنی زندگی میں کلمۂ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو پورا کر لیا ہو۔ اس پر قلندر صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور خاموش ہو گئے۔ حضرت عطارؒ نے بھی کہا تھا کہ زندگی میں لا الہ بھی کس کی پوری ہوئی ہے۔ قبلہ کا اس زمانہ میں بابا قادر اولیاءؒ سے تعلق قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے اب بابا جان کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی تھی کہ یہ دوسری جگہ سے کیسے انعامات واکرامات اور تعلیم کے طالب ہوئے۔ پھر ہمت کر کے بابا جان کے پاس پہنچے۔ بابا جان نے خود ہی فرمایا کہ کوئل، بھولا سا جانور ہے مگر اپنے انڈے کوے کے گھونسلے میں رکھ دیتا ہے۔ کوا اپنے سمجھ کر بچے نکالتا ہے اور پالتا ہے۔ پھر جب بچوں کے پَر آجاتے ہیں تو کوئل ایک آواز دیتی ہے اور بچے اڑ کر ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔

تقسیم ہند کے وقت علی گڑھ میں ہندو مسلم فسادات کا خطرہ زور پکڑ رہا تھا۔ راتوں کو جاگا جاتا۔ خاکسار تحریک والے اور دوسرے لوگ علی گڑھ والوں اور یونیورسٹی کو بچانے کی تدابیر کرتے۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جن سنگھی آس پاس کے شہروں اور گاؤں میں لوگوں کو تیار کرنے میں لگے ہیں کہ ایک لشکر سا بنا کر علی گڑھ پر حملہ آور ہوں قبلہ چند ساتھیوں کو لے کر بچتے بچاتے قلندر صاحب کے پاس دہلی پہنچے۔ اور عرض کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے اور آپ چپ بیٹھے ہیں۔ قلندر صاحب نے فرمایا کہ ہیں کتنے مسلمان۔ تو قبلہ نے عرض کی کہ اعمال کیسے ہی ہوں مگر آخر ان عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جوانوں کی یہی تو خطا ہے کہ کلمہ پڑھتے ہیں محمدؐ کے نام لیوا ہیں۔ اس پر قلندر صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ فرمایا اچھا جائو لوگوں کو کہہ دو کہ ہر چوک پر کھڑے ہو کر بہ آوازِ بلند ھو اللہ اَحَد اللہ الصمد پڑھیں واپس علی گڑھ پہنچے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو ایک دن میں خبر

لگی کہ وہ جن سنگھی جو دوسرے گائوں اور شہروں سے لشکر لے کر چلے تھے اور علی گڑھ سے دور خیمہ زن تھے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور نوبت یہ آئی کہ ایک دوسرے کا سر توڑ ڈالا۔ اس طرح وہ ہاتھیوں کا لشکر خود ہی برباد ہو گیا۔

☆...☆...☆